یگانہ اور فراق کی غزل: رومانوی تحریک کے تناظر میں

ڈاکٹر عابد سیال *

Abstract:

Yas Yagana Changezi and Firaq Gorakhpuri are very important poets for their contribution in estabilishing new style of Urdu Ghazal in modern era. They were contemporaries of Romanvi Tehreek in Urdu literature but they are not discussed in this context. In this article the writer has tried to identify Romantic elements in their Ghazal.

رومانوی تحریک کے دور کے دو غزل گو ایسے ہیں جن کو مکمل طور پر رومانوی غزل گو نہیں کہا جا سکتا، تاہم ان کے ہاں جو رومانوی عناصر موجود ہیں، وہ اس قوت کے ساتھ ابھرے ہیں کہ آنے والے ادوار کی شاعری پر ان کے اثرات دور رس ہیں۔ جدید غزل کے خدوخال متعین کرنے اور اسے بیسویں صدی کے انسان کی آواز بنانے میں اقبال کے بعد بہت سے بڑا حصہ انھی غزل گوؤں کا ہے اور آئندہ ادوار کی تحریکوں کے پس منظر میں ان دو شعرا کی غزل کی کارفرمائی مسلّم ہے۔ یہ دو غزل گو یاس یگانہ چنگیزی اور فراق گورکھپوری ہیں۔ بقول نظیر صدیقی:

> ''گذشتہ پچیس تیس سال سے اردو غزل کے باب میں جو سب سے اہم تصور کیے جا رہے ہیں وہ یگانہ اور فراق کے نام ہیں جن سے جدید ذہن اپنے آپ کو قریب تر محسوس کرتا رہا ہے۔ یہ دونوں شاعر مذاق و مزاج کے اعتبار سے ایک دوسرے کی ضد ہیں لیکن دونوں کی شاعری جدید ذہن کے کئی تقاضوں کو پورا کرتی ہے۔۔۔ یگانہ اور فراق دونوں کی شخصیت اور لہجے میں انفرادیت اتنی واضح ہے کہ شعر و سخن کا معمولی شعور رکھنے والے بھی اسے آسانی سے پہچان سکتے ہیں۔''(۱)

یاس یگانہ چنگیزی (۱۸۸۴ء-۱۹۵۴ء) کا تعلق لکھنوی غزل گوؤں کی بزمِ آخر سے ہے تاہم تقلید کی روش سے طبعی منافرت اور غرور و تعلّی کے سبب ان کے ہاں بغاوت اور انحراف کے رویے پیدا ہوئے، اسی وجہ سے ان کی غزل ایک منفرد تیور رکھتی ہے۔ ڈاکٹر محمد حسن نے رومانوی تخلیق کاروں کے ہاں جن عناصر کی موجودگی کا ذکر کیا ہے،

* استاد شعبہ اُردو، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد۔

ان میں انفرادیت، انفرادیت کی عظمت، احساسِ برتری اور طاقت و جبروت کا ادعا، روایت کے تصورات پر شک کرتے ہوئے پرانے بتوں کو توڑنا بھی شامل ہیں۔(۲) یگانؔہ کی شاعری اور شخصیت میں یہ تمام عناصر پائے جاتے ہیں۔تاہم ان عناصر کے نتیجے میں ان کے ہاں وہ اثرات پیدا نہیں ہوئے جو رومانوی لکھنے والوں سے مخصوص ہیں۔ انھوں نے ان سے انفعالیت، مجہولیت اور زندگی سے فرار کی بجائے حرب و پیکار کا رویہ اخذ کیا ہے جس سے ان کے ہاں ایک مردانہ لہجہ پیدا ہوا ہے۔لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ ان کے ہاں لطافت، رنگینی اور حسنِ جمال جیسے عناصر ناپید ہیں۔

یگانؔہ کو اپنے شخصی رویوّں کے باعث تحسین کی بجائے مخالفت کا سامنا زیادہ کرنا پڑا، خاص طور پر تنقید کا کلاسیکی مزاج رکھنے والے ناقدین کی طرف سے۔چنانچہ آل احمد سرور لکھتے ہیں:

''یاسؔ یگانہ کا یہ شعر ہی ان کے اوپر بہترین تبصرہ ہے:

خودی کا نشہ چڑھا آپ میں رہا نہ گیا
خدا بنے تھے یگانؔہ مگر بنا نہ گیا

لکھنؤ اسکول سے ردِعمل کے طور پر ان کے یہاں بندگی و بیچارگی کے خلاف بغاوت ضرور ملتی ہے، مگر اسے فرحت بخش نہیں کہہ سکتے۔طاقت سے زیادہ ان کے یہاں اکڑ ہے، یہ حریمِ حسن میں بھی اپنے آپ کو بھلا نہیں سکتے۔۔۔ان میں طنزیاتی روح اس قدر نمایاں ہے کہ یہ ان کی شعریت پر برا اثر ڈالتی ہے۔۔۔ ان کے یہاں قوتِ ایجاد کی کمی نہیں، انھیں کوئی کسی کا مقلد نہیں کہہ سکتا مگر ان کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ انھوں نے پینترے ہی کو آرٹ سمجھ لیا ہے۔''(۳)

لیکن جدید دور کے بعض کڑے نقاد بھی ان کی شاعری کی کئی ایک امتیازی خصوصیات کی بنا پر ان کے بارے میں مثبت رائے رکھتے ہیں۔مجنوں گورکھپوری ان کے کلام کو نئے عہد کے تقاضوں سے ہم آہنگ دیکھتے ہیں۔ان کا کہنا ہے:

''یاسؔ اردو غزل میں پہلے شخص ہیں جن کی شاعری میں وہ کس بل محسوس ہوتا ہے جس کو ہم صحیح اور توانا زندگی سے منسوب کرتے ہیں۔۔۔یاسؔ پہلے شاعر

ہیں جو ہم کو زندگی کا جبروتی رخ دکھاتے ہیں اور ہمارے اندر سعی و پیکار کا ولولہ پیدا کرتے ہیں۔۔۔ان کی غزلوں کی سب سے نمایاں خصوصیت مردانہ عزم و اعتماد ہے۔۔۔انھوں نے غزل میں واقعی بت شکنی کی ہے اور روایتی موضوعات اور اسالیب دونوں سے انحراف کر کے ہم کو غزل کی امکانی وسعتوں سے آگاہ کر دیا ہے۔۔۔یاسؔ ان لوگوں میں سے ہیں جن کے کلام کی رہنمائی میں غزل کی ایک بالکل نئی نسل پیدا ہو سکتی ہے جو اس قابل ہو کہ زندگی کے نئے میلانات اور نئے مطالبات سے عہدہ برآ ہو سکے۔"(۴)

کلیم الدین احمد جو اردو شاعری میں حد سے بڑھی ہوئی قنوطیت سے نالاں ہیں یگانہؔ کے کلام کو اس مبرا پا کر ان کے شعری لہجے کو سراہتے ہیں۔وہ لکھتے ہیں:

"انھوں (یگانہؔ) نے چند مخصوص وجہوں کے سبب سے صحتِ زبان، لطف محاورہ کی طرف زیادہ توجہ کی اور اس میں نمایاں کامیابی بھی حاصل کی۔ان کی شاعری کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس میں زور، شگفتگی اور انبساط ہے۔قنوطیت کا نام و نشان نہیں۔ان کا لہجہ بلند ہے لیکن آواز خوش آئند ہے۔۔۔"(۵)

سلیم احمد کی رائے میں:

"برصغیر میں بیسویں صدی کی زندگی کے ایک اہم گوشہ کی تفہیم یگانہؔ کے مطالعہ کے بغیر نہیں ہو سکتی۔یگانہؔ کی شاعری میں ہم ایک ایسے فرد سے دوچار ہوتے ہیں جس کا رشتہ روایتی اقدار سے ٹوٹ چکا ہے اور اس نے جو اپنی انفرادی اقدار قائم کی ہیں، ان کا اس کے زمانے سے ایسا شدید تصادم ہے کہ ہم آہنگی کی صورت نہیں نکلتی۔۔۔یگانہؔ اپنے بل پر زندگی گزارنا چاہتے ہیں اور خود کو اس حد تک خود مکتفی بنانے کی کوشش کرتے ہیں کہ عالمِ خارجی سے ان کا تعلق بے نام رہ جائے۔۔۔یگانہؔ کی غزل کا مرد بیسویں صدی کی اتنی سچی نفسیات رکھتا ہے کہ ہم سب کے وجود کی تہوں میں اس کی موجودگی سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔"(۶)

ڈاکٹر ایم۔ڈی تاثیر کے بقول:

> ''یاسؔ کے کلام کا ایک اور پہلو بہت اہم ہے۔اس میں ایک ہم آہنگ طرزِ خیال پایا جاتا ہے، جو ایک مکمل شخصیت کا آئینہ دار ہے ۔۔۔ یاسؔ کی شاعری محض حیات و جذبات کی ترجمانی پر اکتفا نہیں کرتی۔اس میں تنقیدِ حیات کا عنصر بھی پایا جاتا ہے۔قدرتِ زبان کی وجہ سے یاسؔ گہرے خیالات، صاف بامحاورہ عبارت میں بیان کرتا ہے اور اس کا کلام محاورہ برائے محاورہ اور بے معنی رعایتِ لفظی سے عموماً پاک ہے۔''(۷)

مندرجہ بالا معروضات اور آراء کی روشنی میں یہ نتیجہ نکالنا شاید اتنا غلط نہ ہوگا کہ باطنی تحریک کے لحاظ سے یگاؔنہ رومانوی ہیں۔ ماحول سے عدم مطابقت کے نتیجے میں اور اپنی انفرادیت کی بالادستی قائم رکھنے کے لیے انحرافی روش اختیار کرنا بلاشبہ رومانوی رویہ ہے۔تاہم انھوں نے بات محض انحراف تک نہیں رکھی بلکہ انہدام تک لے آئے ہیں۔ انھوں نے اس تخریب سے تعمیر کا کام بھی لیا اور اپنی الگ دنیا بھی بسائی۔ہاں اتنا ضرور ہے کہ یہ دنیا ماورائی اور تخیلاتی کی بجائے حقیقی ہے؛ لطیف اور کیف آفریں ہونے کی بجائے کھردری اور تلخ ہے؛ اور اس میں تسکین و فرحت کی بجائے تصادم و پیکار ہے۔ان اثرات تک پہنچ کر ان کا جہان رومانوی تحریک کے مخصوص اثرات کی دنیا سے الگ ہو جاتا ہے۔بہرحال اگر انھیں پورے طور پر رومانوی نہ بھی سمجھا جائے تو بھی ان کے کم از کم ایک رومانوی رویے سے انکار ممکن نہیں جس کا ذکر اوپر ہوا، اور یہ ایک رویہ اتنا توانا ہے کہ پوری بیسویں صدی کے آئندہ ادوار کی غزل میں اپنی موجودگی کا احساس دلاتا ہے۔

پہاڑ کاٹنے والے زمیں سے ہار گئے
اسی زمین میں دریا سمائے ہیں کیا کیا

نگاہِ شوق سے کیا کیا گلوں کا دل دھڑکتا ہے
مبادا رنگ و بو اڑ جائے پامالِ نظر ہو کر

نگاہِ یاسؔ سے ثابت ہے سعیِ لا حاصل
خدا کا ذکر تو کیا بندۂ خدا نہ ملا

ہاں کیوں نہ پار اتر چلوں خمیازہ جھیل کر
ڈوبے مِری بلا عرقِ انفعال میں

بات ادھوری مگر اثر دونا
اچھی لکنت زبان میں آئی

فراق گورکھپوری (۱۸۹۶ء-۱۹۸۲ء) کا شماران چند شعرا میں ہوتا ہے جو اپنے معاصرین میں مغربی ادب اور اس کے سانچوں کا گہرا شعور رکھتے تھے۔ تاہم اس واقفیت کو انھوں نے اپنی مشرقیت میں گہرائی اور گیرائی پیدا کرنے میں صرف کیا اور آنے والے ادوار کی شاعری پر دوررس اثرات مرتب کیے۔

فراقؔ اپنے دورِ ریاضت میں جن شعرا سے متاثر ہوئے ان میں حسرتؔ، اصغرؔ، یگانہؔ اور اقبال شامل ہیں۔ اس سے پہلے وہ امیرؔ مینائی سے بھی استفادہ کر چکے تھے۔ کچھ ان اثرات کی وجہ سے، کچھ مغربی مطالعے کی وجہ سے، اور کچھ رومانوی تحریک کے پیدا کردہ شعری ماحول کے باعث ان کے ہاں رومانوی اثرات پیدا ہوئے۔ چنانچہ محمد خاں اشرف، فراقؔ کو ان شعرا میں شامل کرتے ہیں جن پر رومانوی تحریک کا گہرا اثر رہا ہے۔ (۸) ڈاکٹر وقار احمد رضوی نے فراقؔ کا ذکر ترقی پسند شعرا کے ذیل میں کیا ہے۔ اور فراق کے تذکرے میں بھی وہ اس کا اعادہ ان الفاظ میں کرتے ہیں: ''ترقی پسند شعرا میں فراقؔ کی غزل نمایاں حیثیت رکھتی ہے''۔ (۹) اور ''اردو میں ترقی پسند تحریک فراقؔ اور فیضؔ کے پائے کے دوسرے غزل گو شاعر پیدا نہ کر سکی''۔ (۱۰) لیکن فراقؔ کی شاعری کے عناصر کا جائزہ لیا جائے تو وہ رومانوی رویوں کے نسبتاً زیادہ قریب ہیں۔ فراقؔ کا مطبوعہ کلام ۱۹۱۹ء سے ملتا ہے تاہم انتظار حسین کا کہنا ہے کہ ''فراقؔ صاحب کا ۳۸ء تک کا زمانہ شعری ریاضت کا زمانہ ہے''۔ (۱۱) فراقؔ کی پہلی کتاب ۱۹۴۵ء میں چھپی۔ تاہم اس دور کی شاعری بھی ان کی انفرادیت کا پتا دیتی ہے۔ ڈاکٹر نوازش علی ان کی اس کتاب کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''یہ اشعار اپنے منفرد طرزِ احساس و اظہار کی وجہ سے اپنا رشتہ کسی حد تک روایتی غزل سے منقطع کرتے اور جدید غزل سے اپنا ناطہ جوڑتے نظر آتے ہیں۔ ان اشعار میں فراقؔ کی اپنی شخصیت اور ان کا عہد اور ان کے عہد کی زندگی کے مسائل گھل مل کر ایک نئی شکل اختیار کرنے کی کامیاب سعی کرتے ہیں۔'' (۱۲)

فراقؔ نے زندگی کے نئے میلانات سے پیدا ہونے والی نفسیاتی پیچیدگیوں کا ادراک کیا اور انھیں بلیغ اور سنجیدہ اشاروں سے قاری تک پہنچانے کی کوشش کی۔ فراقؔ کی ازدواجی زندگی ناآسودہ تھی جس کا ردِ عمل ان کے ہاں عشق کے ایک گہرے اور نئے زاویے کی صورت پذیری کرتا ہے جو آگے چل کر زندگی اور کائنات سے اپنے رشتے جوڑتا ہے۔ ان کی غزلوں میں زندگی اور عشق ایک ہم آہنگ صورت میں ظاہر ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر علی احمد فاطمی کہتے ہیں:

> ''اگر کوئی یہ سمجھے کہ فراقؔ کا تصورِ عشق محض فراقؔ کی اپنی افتادِ طبع، اپنے حادثات و تجربات کی بنیاد پر کھڑا ہے تو یہ بات پورے طور پر سچ نہ ہوگی۔ فراقؔ کا عشق ان کی اپنی جنس زندگی کے بطن سے پھوٹتا ہے لیکن جلد ہی ان کا انسانی و اخلاقی شعور زمانہ اور وارداتِ زمانہ سے فطری رشتے جوڑتا ہوا، بولتی اور دھڑکتی ہوئی انسانی تہذیب اور بشری تحریم کے قوس قزح میں ایک دلکش اور متاثر کن رنگ بھر کر ابھرتا ہے۔ بات صرف یہیں تک نہیں بلکہ ان تمام سیاسی اور سماجی تحریکات سے بھی اثر قبول کرتا ہے جس کو فراقؔ نے محسوس کیا اور تحلیل کیا۔'' (۱۳)

ریاض احمد نئے عہد کی صورت حال کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''مادی اقدار کے احساس نے خودگزینی کے دائرے سے نکل کر خارجی اقدار کی طرف متوجہ کیا اور اب ہم حسن و عشق کی دنیا سے باہر کی زندگی کو بھی غزل میں پیش کرنے لگے۔ فراقؔ کی غزل اس کی مثال ہے۔ مذہبی، فلسفیانہ اور خالص سیاسی اقدار کے علاوہ زندگی کی عام اقدار، زندگی کی چھوٹی بڑی سبھی چیزوں سے شغف اور ان سے وابستہ جمالیاتی تحریک فراقؔ کی غزل میں نمایاں طور پر موجود ہیں۔'' (۱۴)

فراقؔ کی شاعری کا سفر طویل عرصے پر پھیلا ہوا ہے۔ لکھنوی اساتذہ کے دور سے لے کر رومانوی تحریک، اقبال، ترقی پسند تحریک اور اس کے بعد تک کے ادبی رجحانات ان کے سامنے ظہور پذیر ہوئے اور انھوں نے ان سے اثر قبول کیا۔ وہ ایسے شاعر نہیں ہیں جو کسی ایک طرزِ ادا کو دریافت کرتا اور اسی کا ہو کر رہ جاتا ہے بلکہ وہ اپنی شاعری کو نئے لہجوں اور نئے قرینوں سے سنوارتے رہے۔ اسی بنا پر بعض نقادوں کو ان کے اس دور کی شاعری میں فنی پختگی کی کمی کا احساس ہوتا ہے۔ چنانچہ ایم۔ ڈی تاثیر لکھتے ہیں کہ ''فراقؔ ۔۔۔ ابھی ناپختہ ہیں۔ مگر (شاید اسی لیے) وہ پختہ

کاروں سے زیادہ نئی پود کے صحیح ترجمان ہیں۔ ان میں ہضم و تحلیل کم ہے۔ رائج تاثرات کو زیادہ شخصی مداخلت کے بغیر اگل دیتے ہیں'' (۱۵)۔ تاہم خلیل الرحمٰن اعظمی کی رائے میں یہ بات فراقؔ کے حق میں ہو نہ ہو اردو غزل کے حق میں ضرور جاتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''عام طور پر غزل کا شاعر ایک مرتبہ اپنی آواز کو دریافت کر لینے اور اپنا مخصوص اسلوب متعین کر لینے کے بعد عمر بھر کے لیے اسی کا ہو رہتا ہے۔۔۔لیکن فراقؔ صاحب نے ایسا نہیں کیا۔ وہ اب بھی نئی سے نئی کیفیات کو قابو میں کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور ان کی آواز پھر ایک بار بکھر جاتی ہے اور۔۔۔مزید نئے نئے الفاظ اور نئے نئے لہجوں کو برتنے کا تجربہ کرنے لگتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ انھیں پھر۔۔۔ ناکامیوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔۔۔ ان کا یہ رویہ ان کی شاعری کے اسقام میں خواہ کتنا ہی اضافہ کرے لیکن اردو غزل کے حق میں مفید ہوگا۔ فراقؔ زندہ، متحرک اور حقیقی شاعر ہیں، محض استادِ فن نہیں۔'' (۱۶)

فراقؔ کی غزل روایت اور جدت کے سنگم پر کھڑی ہے۔ وہ روایت کے زندہ عناصر سے بھی غفلت نہیں برتتے اور جدید زمانے کا شعور بھی رکھتے ہیں۔ انھوں نے اپنی غزل میں قدیم و جدید کو ایک حسین اور متوازن امتزاج کے ساتھ پیش کرنے کی سعی کی ہے۔ آج جبکہ ایک طویل سفر کے بعد جدت کے اس رنگ میں بہت زیادہ نکھار آ چکا ہے، فراقؔ کی غزل شاید اتنی جدید نہ لگے لیکن ان کی غزل کو اگر ان سے ماقبل کی غزل کے تناظر میں دیکھا جائے تو یہ بلاشبہ نئے دور کی نقیب معلوم ہوتی ہے۔ ڈاکٹر نوازش علی کی یہ رائے فراقؔ کی غزل کا نپا تلا محاکمہ کرتی ہے:

''فراقؔ کی غزل اپنے عہد میں جدید اس لیے تھی کہ ایک طرف وہ غزل بنیادی روایت سے ہم آہنگ تھی تو دوسری طرف ان کی غزل نے تخلیقی روایت کو اس قابل بنایا کہ وہ اپنے عہد کی جدید حسّی تبدیلیوں کو اپنے اندر سمیٹ سکے۔ فراقؔ کی غزل میں ہم ایک ایسے انسان سے دوچار ہوتے ہیں جو نئے سرے سے کائنات پر غور کرتا ہے اور عہدِ حاضر کی پیچیدہ نفسیات، مغرب سے آئے ہوئے نظریات، نئے عاشق و معشوق اور ان کے بدلتے ہوئے عشقیہ رویّوں اور اپنے عہد کے سیاسی و سماجی سوالوں سے الجھتا ہوا ایک نئی فکر کو جنم دیتا ہے۔۔۔فراقؔ

نے تخلیقی شعور اور شعری روایت کو بیسویں صدی کے شعور کا حصہ بنایا اور اس شعور کو جدید نفسیاتی اور سماجی تقاضوں سے ہم آہنگ کیا۔"(۱۷)

تھی یوں تو شامِ ہجر مگر پچھلی رات کو
وہ درد اٹھا فراقؔ کہ میں مسکرا دیا

میں آسمانِ محبت پہ رخصتِ شب ہوں
ترا خیال کوئی ڈوبتا ستارہ ہے

تمام خستگی و ماندگی ہے عالمِ ہجر
تھکے تھکے سے یہ تارے تھکی تھکی سی یہ رات

چمکتے درد ، کھلے چہرے ، مسکراتے اشک
سجائی جائے گی اب طرزِ نو سے بزمِ حیات

خیالِ گیسوئے جاناں کی وسعتیں مت پوچھ
کہ جیسے پھیلتا جاتا ہو شام کا سایہ

یہ دو شعراء زمانی اعتبار سے رومانوی تحریک کے دَور سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کی غزل اقبال کے بعد کی غزل کو وہ فکری و فنی اساس مہیا کرتی ہے جس پر جدید تر غزل کا قصرِ عالیشان تعمیر ہوا ہے۔ بعد کے ادوار کی غزل میں جو رویے پیدا ہوئے ہیں ان میں ان دو شعرا کا حصہ بہت زیادہ ہے۔ غزل کے لہجے، زبان اور قوت کے اعتبار سے یگانہؔ اور نزاکت، نفاست، نرمی، احساس کی گہرائی اور عشق کی نفسیاتی کیفیات کے اظہار کے حوالے سے فراقؔ کی غزل آئندہ ادوار کی غزل کے تشکیلی عناصر کا درجہ رکھتی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ نظیر صدیقی، ''جدید غزل پاکستان اور ہندوستان میں'' مطبوعہ ''فنون'' لاہور، جدید غزل نمبر، ۱۹۶۹ء، ص ۱۵۹

۲۔ محمد حسن، ڈاکٹر، ''اردو ادب میں رومانوی تحریک''، کاروان ادب، ملتان، ۱۹۹۳ء، ص ۶۸، ۷۲

۳۔ آل احمد سرور، ''تبصرہ'' مشمولہ ''بیسویں صدی میں اردو غزل'' مرتبہ: نیاز فتحپوری، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، طبع اول ۱۹۸۷ء، ص ۲۶۷

۴۔ مجنوں گورکھپوری، پروفیسر، ''غزل اور عصرِ جدید'' مشمولہ ''بیسویں صدی میں اردو غزل'' مرتبہ: نیاز فتحپوری، ص ۲۸۱

۵۔ کلیم الدین احمد، ''بزمِ نگار'' مشمولہ ''بیسویں صدی میں اردو غزل'' مرتبہ: نیاز فتحپوری، ص ۲۴۸

۶۔ سلیم احمد، ''جدید غزل'' مطبوعہ ''فنون'' لاہور، جدید غزل نمبر، ص ۴۰

۷۔ ایم۔ ڈی تاثیر، ڈاکٹر، مکتوب بنام محمود نظامی، ۵ دسمبر ۱۹۳۴ء، مشمولہ ''مقالاتِ تاثیر'' مرتبہ: ممتاز اختر مرزا، مجلس ترقی ادب، لاہور، طبع اول ۱۹۷۸ء، ص ۴۳۱

۸۔ محمد خاں اشرف، ڈاکٹر، ''رومانویت اور اردو ادب میں رومانوی تحریک''، الوقار پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۸ء، ص ۲۱۳

۹۔ وقار احمد رضوی، ڈاکٹر، ''تاریخ جدید اردو غزل'' نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، طبع اول ۱۹۸۸ء، ص ۶۸۰

۱۰۔ ایضاً

۱۱۔ انتظار حسین، ''اردو ادب کا ہمالیہ پہاڑ'' مطبوعہ ''نیا دور'' لکھنؤ، فراق نمبر حصہ دوم، ۱۹۸۴ء، ص ۵۴

۱۲۔ نوازش علی، ڈاکٹر، ''فراق گورکھپوری، شخصیت اور فن''، دستاویز مطبوعات، لاہور، طبع اول ۱۹۹۳ء، ص ۲۳۹، ۲۴۰

۱۳۔ علی احمد فاطمی، ''شاعر، دانشور۔فراق گورکھپوری''، نیا سفر پبلی کیشنز، الٰہ آباد، ۱۹۹۷ء، ص ۳۶

۱۴۔ ریاض احمد، ''دریاب''، پولیمر پبلی کیشنز، لاہور، طبع اول ۱۹۸۶ء، ص ۸۰

۱۵۔ ایم۔ ڈی۔ تاثیر، ''اردو غزل'' مشمولہ ''بیسویں صدی میں اردو غزل'' مرتبہ: نیاز فتحپوری، ص ۲۹۳

۱۶۔ خلیل الرحمٰن اعظمی، ''فراق کو سمجھنے کے لیے'' مطبوعہ ''شاہکار'' فراق نمبر، ۱۹۶۵ء، ص ۴۵

۱۷۔ نوازش علی، ڈاکٹر، ''فراق گورکھپوری، شخصیت اور فن''، ص ۳۶۸